سیدہ طیبہ رباب
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو۔
ڈاکٹر شبیر احمد قادری
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد۔

اقبال کی شاعری پر میر تقی میر کے اثرات

Syeda Tayyaba Rubab
Assistant Professor, Department of Urdu.
Dr. Shabbir Ahmad Qadri
Associate Professor, Department of Urdu, Govt. College University, Faisalabad.

Impacts of Mir Taiq Mir on Iqbal's Poetry

The great poets Mir Taqi Mir and Allama Iqbal have some amazing similarties in thair poetic thoughts. I tried my best to search out the great impacts of Mir Taqi Mir on Iqbal, s poetry. The effort is done to go in the depth of both to understand their high thoughts and their keen observation of human nature, thier societes , their environments, cultures and their values.It is the fact that both were suffering through tough times in their socites, the both felt the pain of humanity . Mir Taqi MIir has rich and high ideas which are reflected by his poetry. Although Iqbal never like to walk in the beaten tracks but he accepted Mir,s Impacts, conciously or Subcociuosly.

Key Words: *Humanity, universal, vast, truth, civilization, society, life, death, mystical, grief, art, philosophy, tradition, soul, top, concept, passion, feeling, sincerity,conscious,impacts.*

میر تقی میر استاد شاعر ہیں ان کے ہاں فنی کمالات میں فکر و احساس کا حسین سنگم نظر آتا ہے تجربات کی صداقت، مشاہدے کی گہرائی اور بیان کی سادگی نے میر کو امر کر دیا ہے۔ میرؔ کے ہاں جذبات کا ترفع ہے جذبات میں سطحیت یا ذاتیات کی بجائے آفاقیت اور گہرائی ہے میرؔ کا تخلیقی عمل جذبے کو احساس کی بھٹی میں کندن بنا کر شعر میں ڈھالتا ہے میرؔ زندگی کے تلخ تجربات میں شیرینی گھولنے کے فن سے بھی خوب آگاہ ہیں اس طرح میرؔ کی خصوصیت بھی عمومیت بن جاتی ہے وہ دل اور عرش کے مقام پر ہوتے ہوئے بھی عوام سے گفتگو کرتے ہیں

میرؔ کے ہاں جذبات واحساسات کی پختگی اور نزاکت، اظہار کی سلاست، روانی اور سادگی، فکر و شعور کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے میرؔ کی شاعری کا محور عشق ہے جو عمومیت سے ہوتا ہوا کائنات کی وسعتوں پر حاوی ہو جاتا ہے میر کا فن عشق سے نمو پا کر اظہار کی صورت اختیار کرتا ہے یہ عشق ذاتی بھی ہے، کائناتی بھی، آفاقی بھی، حقیقی بھی، اور مجازی بھی۔

عشق ہے طرز و طور، عشق کے تیئں
کہیں بندہ کہیں خدا ہے عشق (۱)

میرؔ کے تصور عشق میں، عشق مجازی عرفانِ ذات کی دہلیز تک لے جاتا ہے عشق مجازی کی انتہا میں فکر و احساس کا مرکز و محور انسان کی اپنی ہی ذات ٹھہرتی ہے عرفانِ ذات عرفانِ خداوندی کا ذریعہ ہے اس خود شناسی سے ’’انسان میں وہ صفات خداوندی پیدا ہو جاتی ہے جن سے اعلیٰ اخلاقی اقدار پیدا ہوتی ہیں اور انسان قناعت بے نیازی انکسار ایثار اور فقیری جیسی صفات سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔‘‘(۲)

سر گزشتِ ما مصیبت دیدگانِ عشق را
قصہ مجنوں مداں، ایں داستان دیگر است
ازدرت امروز و فردا می روم ہوشیار باش
سجدہ مستانہ بابِ آستان دیگر است (۳)

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن
سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے (۴)

میرؔ کا عشق قدم بہ قدم چلتا ہوا عشق کی دوسری داستان سے ہمکنار ہو جاتا ہے جہاں عشق سر الٰہی بن کر سینوں میں پنہاں ہے یہی سینہ طور بن جاتا ہے جو کہ حق کی تجلی کا مرکز ہے یہی عشق عالم بالا میں بھی جاری و ساری ہے، سینوں میں بھی اور کائنات میں بھی، گویا انسان اس کائنات میں ایک راز نہاں ہے جسے عشق کی رمز آشکار کرتی ہے۔ میرؔ کا عشق زندگی اور شخصیتِ انسانی میں، فرد و اجتماع میں توازن لے کے آتا ہے عشق کے بغیر فرد اور زندگی، سماج اور شخصیت سب کچھ بے معنی، بے مقصد، بے روح اور ہیچ ہے۔ عشق کی نفی کر دو تو خام خیالی، کھوکھلی زندگی، بے حسی اور ظالم سماج باقی رہ جاتا ہے، انسانیت ناپید، مادیت کا خول اور بے شعور معاشرہ، میرؔ کا تصور عشق ہی زندگی کی

بنیادی اکائی اور سب سے بڑی آفاقی سچائی ہے جو فرد اور معاشرے میں اعلیٰ اقدار کو فروغ دے کر زندگی کو معنویت اور روحانیت سے آشنا کرتا اور انسان کو ترفع کی منازل طے کرواتا ہوا اتنا ارفع کر دیتا ہے کہ جہاں فرشتے کا بھی مقدور نہیں۔'' میرؔ کے نزدیک عشق ہی خالق، عشق ہی خلق اور عشق ہی باعث ایجاد خلق ہے۔۔۔۔زندگی تلاشِ عشق ہے اور دل عشق کا مقام خاص۔ خود آگاہی یہیں سے حاصل ہوتی ہے۔اس خود آگاہی سے بندہ خود معبود ہو کر اپنی علویت کا اظہار کرتا ہے۔اس کی خودی گم ہو جاتی ہے اور فرد و کائنات ایک وحدت بن جاتے ہیں انسان کی تخلیق کا باعث یہ ہے وہ زندگی کے اس بھید سے واقف ہو۔''(۵)میرؔ کے ہاں عقل کے مقابلے میں دل کو فوقیت حاصل ہے اس لیے کہ دل عشق کا مرکز ہے اور عشق میرؔ کے ہاں زندگی کا محور ہے۔دل سے حکمت و وجدان کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

قدر رکھتی نہ تھی متاع دل
سارے عالم کو میں دکھا لایا(۶)

دل آدمی کو کمال انسانیت تک پہنچاتا ہے یہاں ظاہری علوم کام نہیں آتے صرف تزکیہ باطن ہی کارگر ہے۔عشق کے نشیب و فراز، عشق کی کوہکنی اور صحرا نوردی، عشق میں طعن و ملامت اور دشوار گزاری، روح انسانی کو پاکیزہ اور طبع انسانی کو ہموار بنا دیتی ہے۔عشق کا سفر گویا انسانیت کا سفر ہے عشق کی بے کراں وسعتیں انسان کو وسیع المشرب بنا دیتی ہیں۔ عشق میں تنگیوں اور کوتاہ نظریوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ عشق متلاطم ہوتا ہے پُرسکون نہیں، عشق کی غوطہ زنی سمندر کی گہرائیوں سے گوہر آبدار نکالتی ہے،اس میں ساحل کی سلامتی نہیں، عشق کی آگ سونے کو کندن بناتی ہے عشق کی حرارت اور تپش حیات بخش ہے عشق کی نزاکت انسان کو لطافت سے ہم کنار کرتی ہے اور عشق کی ان تمام کار فرمائیوں کا مرکز دل ہے۔میرؔ ایک عاشق ہے اور دل اس کائنات کی کتاب زیست، ایک بحر بیکراں جو عشاق کے سینوں میں متلاطم رہتا ہے فقط میر ہی اس کے اضطراب کا باعث نہ تھے،ہمیشہ عشاق اس دل کی داستان رقم کرتے رہے، کبھی کوہساروں میں، کبھی صحراؤں میں، کبھی دیر و حرم میں، یہی میرؔ کے سماج میں کتاب زیست کی عناوین تھے۔عشق شاعری کی اعلی روایت ہے جو بلا تمیز مذہب و ملت پنپتا ہے۔میرؔ کے اعلیٰ وارفع جذبات، عشق کو اور عشق میرؔ کے ہاں زندگی ہے، یوں بالفاظ دیگر زندگی کو، تہذیب عطا کر رہے تھے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ جس سے ایک مہذب معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔کوئی بھی سماج انسانی جذبات کی نفی سے تہذیب کا حصہ نہیں بن سکتاالبتہ جذبات کی تہذیب و تطہیر کارِ دگر ہے جو میر کی شاعری نے خوب کیا۔

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا(۷)

"میر انسانیت کے لیے ایک نظام اخلاق ضروری سمجھتے ہیں، فرد کے جنوں کو آزار مانتے ہوئے بھی وہ اس آزار کی عظمت کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ میر کے دور میں عشق کے آداب ہی زندگی کو ایک بے معنی چکر سے آزاد کرتے تھے۔ یہ عشق فرد کو جذبات کی تہذیب اور سماج کو خیالات کی تہذیب سکھاتا رہا۔ فرد کو نفسانیت، تعیش اور زر پرستی سے بچانے کی کوشش کرتا رہا اور سماج کو تنگ نظری، منافقت اور ظاہر پرستی سے روکتا رہا" (۸) میرؔ کا عشق صرف جذباتی واردات نہیں بلکہ ایک نظام حیات ہے جو زندگی کی اعلیٰ اقدار کا حامل ہے جو حیات انسانی اور سماج کے فکری و تہذیبی نظام کو نئے مفاہیم سے روشناس کرواتا ہے میرؔ کا فن عشق کی انتہائی کٹھنائیوں اور دشوار گزاریوں سے گزر کر زندگی کی عمومی سطح پر واپس آ جاتا ہے تاکہ عشق کے فیض کو عام کر سکے۔"میر کا یہی کمال ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات کو بھی زندگی کی عام سطح پر عام جذبوں سے ملا کر دیکھتے ہیں۔ میر کے لیے اپنی ذات بہت اہمیت رکھتی ہے لیکن جب وہ اپنی تنہائی کو بیان کرتے ہیں تو اسے ذاتی سطح کی بجائے زندگی سے ملا کر اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ میرؔ کی تنہائی ہم سب کی تنہائی بن جاتی ہے۔ ان کے درد و غم سب کے درد و غم بن جاتے ہیں۔ ان کے تجربے ہمارے تجربے بن جاتے ہیں اور ہمارے اندر بھی وہی تخلیقی عمل ہونے لگتا ہے جس کا میرؔ نے تجربہ کیا تھا۔ ان کا تخلیقی عمل اور اس کی انفرادیت زندگی کی اسی عام سطح پر جنم لیتی ہے جہاں شاعر اور عام انسان کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں رہتا۔"
(۹)

دل اور عرش دونوں پہ گویا ہے ان کی سیر
کرتے ہیں باتیں میر جی کس کس مقام سے(۱۰)

عام اور خاص انسان میں صرف ذہنی فاصلہ ہوتا ہے جذبات و احساسات ایک سے ہوتے ہیں، ان کی صرف تہذیب مقصود ہوتی ہے یہی تہذیب انسان کو خاص یا عام بنا دیتی ہے عشق کی دشواریاں، تہذیب نفس کا کام کرتی ہیں جس سے انسان کا مقام بلند ہو جاتا ہے۔ میر کا عشق انسان کو مادیت سے ماوریٰ کر دیتا ہے۔ انسان مادی خواہشات اور مادی مفادات سے بالاتر ہو کر فرد اور سماج کو اقدار عالیہ اور روحانی سکون سے ہمکنار کرتا ہے۔ میر کے دور میں سماج جس انتشار، استحصال، بدحالی اور بدامنی سے دوچار تھا۔ اخلاقی رذائل اور دگرگوں سیاسی حالات سے انسان کی روح زخمی تھی، نتیجتاً انسانیت بھی جان بلب تھی، اس صورتحال میں میر کا تصور عشق مسیحا بن کر فرد اور

معاشرے کو امن کا گہوارہ بنانے کی قدرت رکھتا ہے جو فرد کو تہذیب نفسی سے ہمکنار کر کے تزکیہ نفس کی منزل پر لے جاتا ہے جہاں اخلاق سیہ رخصت ہو جاتے ہیں۔ ان کی جگہ اخلاق عالیہ جاگزیں ہو کر ایثار و خلوص، محبت و ہمدردی، رواداری اور وسیع المشربی انسان کو انسانیت کے کمال پر لا کھڑا کرتی ہے۔ اس طرح میر کا تصور عشق معاشرے کے ناسوروں کا مرہم بن جاتا ہے۔ جو انسان کے لیے امن و سکون کا باعث ہے جہاں روحانی اقدار کو پنپنے کا موقع ملتا ہے میر کے عشق نے جنگ سے امن تک کا یہ سفر عشق کے صحراؤں اور ریگزاروں کی صعوبتیں برداشت کر کے، پہاڑوں کی کوہکنی کر کے اور سب سے بڑھ کر انسانی بستیوں کی رونق میں تنہا ہو کر، گردش ایام کو اپنی ذات پر سہہ کر طے کیا ہے۔ تب کہیں جا کر وہ خاک کے پردے سے نکلے ہیں اور یہی وہ مقام شوق ہے جو قدسیوں کے بس کا نہیں۔

فرشتہ　جہاں　کام　کرتا　نہ　تھا
میری　آہ　نے　برچھیاں　ماریاں (۱۱)

" اٹھارویں صدی کا زوال پذیر معاشرہ اگر عشق کے اس تصور سے پوری طرح آشنا ہو جاتا جس میں اعلی مقصد کے لئے جان دینا نئی زندگی کا آغاز ہوتا تو پھر زوال کو عروج سے بدلا جاسکتا تھا۔ میرؔ کے تصور عشق میں موت کے یہی معنی ہیں۔ ع "موت کا نام پیار کا ہے عشق" یہ وہی تصور عشق ہے جو بیسویں صدی میں اقبال کی شاعری میں نئے تیور کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور عقل کا مدمقابل ٹھہرتا ہے۔ ع "مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی" کے معنی بھی اسی تصور عشق کے حوالے سے سمجھے جاسکتے ہیں" (۱۲) اقبال کا تصور خودی عرفان ذات سے عرفان حق کا سفر ہے میر کا تصور عشق انسان میں جمالی صفات پیدا کرتا ہے۔ انسان کو سطحی اغراض و مقاصد سے بے نیاز کر کے کمال کی جانب گامزن کرتا ہے جہاں انسان کائنات کی وسعتوں پر حاوی ہے اللہ کا مقرب ہے۔ اقبال کا تصور عشق جلال و جمال دونوں خصوصیت کا حامل ہے۔ میر کا تصور عشق اقبال کے تصور عشق سے مختلف ضرور ہے لیکن منتہائے مقصود دونوں کا اس حد تک مشترک ہے کہ دونوں انسان کو باطنی تطہیر کی منزل تک لے جاتے ہیں۔ میر مجاز سے حقیقت تک کے سفر کی مشکلات سے گزر کر روشنی حاصل کرتے ہیں یہ ایسا مقام ہے جہاں روح انسانی، مادی زندگی سے ماوریٰ انسانی عظمت کا مشاہدہ کرتی ہے جبکہ اقبال تزکیہ نفس کے مراحل، خودشناسی سے خودی کی تکمیل تک، ارکان اسلام پر خلوص نیت سے کاربند ہونے سے، طے کرواتے ہیں۔ اس سفر میں درپیش مشکلات استحکام خودی کا باعث ہیں۔ اقبال کے نزدیک جہدِ مسلسل اور قلب و روح کا محوِ سفر رہنا ہی عشق ہے۔ اقبال کے ہاں عشق زندگی ہے اور زندگی عشق۔

جب تک عشق ہے تب تک انسان محو عمل ہے اور جب تک عمل ہے تب تک زندگی ہے یعنی عمل اور زندگی اقبال کے ہاں مترادفات ہیں رک جانا اقبال کے نزدیک موت ہے۔

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موجِ زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم ، گر نہ روم نیستم(۱۳)

اقبال کے ہاں عشق وخودی لازم وملزم ہیں۔ عشق خودی کا احساس دلاتا اور تکمیل خودی میں عمل پیہم کا باعث ہے۔ جب کہ خودی عشق کی پہچان ہے۔ اقبال کے تصور عشق میں ان کی نظم ''مسجد قرطبہ'' سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اس میں وہ عشق کے مقامات اور مرد مومن کی صفات بیان کرتے ہیں جو کہ صاحب عشق ہے ۔عشق کی ہزاروں منازل ہیں۔ عشق مسلسل محو سفر ہے اقبال عشق کو ابن السبیل کا خطاب دیتے ہیں۔ صاحب عشق کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے جو کائنات پر غالب ہے اقبال اسے مرد مومن کے نام سے یاد کرتے ہیں مرد حر، مرد قلندر، انسان کامل، بندہ حق، مرد آفاقی سب اسی کے مترادفات ہے۔ اس کی خودی کی تکمیل ہو چکی ہے اب یہ گردش ایام سے آزاد اور اللہ کی طاقت سے لیس ہے دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔

میرؔ کا عشق مجازی اپنی ذات کے سفر اور ذات کی پہچان سے گزر کر عشق حقیقی سے جا ملتا ہے۔ یہ خود شناسی میر کو اندر کے انسان سے متعارف کرواتی ہے۔ میر کے ہاں خود شناسی خدا شناسی کا دوسرا رخ ہے اقبال بھی اس نظریے کے زیراثر ہیں خودی عشق کی مرہون منت ہے۔ گویا میر کا تصور عشق جو کائنات پر حاوی ہے اور اس کار خانے پر عشق ہی مسلط ہے، اقبال کے ہاں خودی اس مقام پر فائز ہے۔ عشق آرزوئیں پیدا کرتا ہے لیکن اس حوالے سے اقبالؔ اور میرؔ میں کوئی موافقت نہیں میرؔ انسان کے خدا ہونے میں آرزو کو رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے(۱۴)

گویا میرؔ کے ہاں آرزو سے مراد نفسانی خواہشات ہیں جبکہ اقبال، سفر عشق اور تکمیل خودی میں آرزو کو لازمی گردانتے ہیں:

دوا ہر دُکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا(۱۵)

گویا آرزو کی معنویت اقبال کے ہاں بدل جاتی ہے جدید تنقید کی رو سے ہر فنکار لفظ کو نئے معانی سے روشناس کرواتا ہے لفظ کو نئی معنویت عطا کرنا عظیم فنکار کا خاصہ ہے یہ خاصیت ہمیں اقبال کے ہاں خاص جدت سے نظر آتی ہے جیسا کہ اقبال نے خودی کو نیا مفہوم دیا۔ اقبال سے پہلے خودی کا لفظ تکبر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا لیکن اقبال نے اسے خود شناسی کے معنوں میں استعمال کیا۔ اقبال کا تصور عشق ایسا عشق ہے جو سوز حیات ہے اس کے بغیر خودی کی تکمیل ممکن نہیں۔ یہ عشق ہی ہے جو انسان کو فقر واستغنا سکھاتا ہے۔ مشکلات کا مقابلہ کرتا ہوا کارزارِ حیات میں آگے سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ عرفان ذات سے عرفان الٰہی کے تمام مراحل عشق طے کرواتا ہے۔ عشق اپنے منصب پر زندگی میں ایسے رواں دواں ہے جیسے رگوں میں خون۔

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گُل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نَم(۱۶)

اقبال کا عشق نا تو صوفیا کا روایتی عشق ہے، نہ عشق مجازی، نہ حقیقی بلکہ یہ تو قوت حیات ہے جو روح کو سرگرم عمل رکھتی ہے۔ عشق انسان میں اوصاف حمیدہ پیدا کرتا ہے جس سے انسان اپنی منزل کا تعین کرتا ہوا ارتقائی منازل سے ہمکنار ہوتا چلا جاتا ہے اسی لئے عشق تکمیلِ خودی میں معاون ہے اقبال کا عشق کہیں ٹھہرتا نہیں، مسلسل محو سفر رہتا ہے عشق آرزوؤں کو جنم دیتا ہے ہزاروں مقام اور منزلیں پا کر بھی یہ ایک نئی منزل کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ عقل و عشق کے موازنہ میں اقبال عشق کو فوقیت دیتے ہیں یہ عشق ساری دنیا پر غالب آجاتا ہے اس لیے اقبال کا تصور عشق اس حد تک میر کے ارفع تصور عشق سے اثر پذیر ہے کہ میر کا عشق بھی کائنات پر حاوی ہے اگرچہ اقبال کے تصور عشق کا دائرہ زیادہ وسیع اور جذبہ عمیق تر ہے لیکن میرؔ کا عشق بھی اپنا ایک تقدس رکھتے ہوئے کارگہ حیات کی سب سے اعلیٰ قدر بن جاتا ہے میر کے والد نے جو عشق کی تعلیم دی تھی "میر نے اسی تصور کو، اپنی شاعری کے ذریعے، انسانی تخیل کا حصہ بنا کر، جذباتی و عملی سطح پر محسوسات کی شکل دے دی اور ساتھ ساتھ اس تصور کی علویت کو غم و حزن کی لے سے ملا کر ایک وحدت بنا دیا۔"(۱۷) میر کی شاعری میں اعلی ترین زندگی عشق ہے

میر کی غمگینی عشق کے باعث ہے گویا غم بھی زندگی کا خاصا ہے۔ میر عشق و غم کے لطیف ترین، اعلیٰ ترین اور گہرے جذبات و احساسات کو اپنے باطن میں سمو کر سادگی کی سطح پر لے آتے ہیں۔ ''میرؔ زندگی کے دوسرے امور اور دوسرے تجربات بھی عشق کے رمز و کنایہ کے حوالے ہی سے بیان کرتے ہیں۔ ایک پوری تہذیب کی تباہی کو اپنی تباہی سمجھتے ہیں۔ غم دوراں بھی ان کا اپنا غم ہے اور ان کی غزل میں غم جاناں کی صورت اختیار کر کے نمایاں ہوتا ہے۔''(۱۸)

ہر صبح غموں میں شام کی ہم نے
خونابہ کشی مدام کی ہم نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے تمام کی ہم نے(۱۹)

دل کی تہہ کی کہی نہیں جاتی نازک ہیں اسرار بہت
انچھر ہیں تو عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت(۲۰)

''شاعری اس خونابہ کشی کی داستان ہے، اس مر مر کے تمام کرنے کے نام ہے، ہاں اس خونابہ کشی، اس مر مر کے تمام کرنے کے بہت سے نام ہیں، زندگی کے اس بستار کو عشق کے دو انچھر میں سمولینا قطرہ میں دجلہ دیکھنا اور دکھانا میر کا کمال ہے۔ ان کی عظمت کا راز اسی کمال میں ہے اسی سے ان کا مطالعہ سدا بہار ہے بلکہ جب جب زندگی کسی نازک موڑ پر آئے گی اور مر مر کے زندگی کرنا ایک نئی معنویت حاصل کرے گا ،میرؔ کی عظمت کو نئے سرے سے دریافت کیا جائے گا۔''(۲۱)

کوچۂ او را چمن کردیم چوں رخصت شدیم
ریخت رنگِ تازہ صدجا دیدۂ خوں بارِ ما(۲۲)

میر کی داخلی اور خارجی زندگی غموں کا مجموعہ تھی داخلی زندگی میں ذاتی حوالے سے ہمیشہ غموں سے دوچار ہے بچپن میں یتیمی کا صدمہ، عزیز و اقارب کا ناروا سلوک، زمانے کی بے مروتی اور عشق میں ناکامی ایسے عوامل تھے

جنہوں نے میر کی طبیعت کو حساس اور درد مند بنا دیا۔ میر کو دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ دہلی کے گلی کوچوں میں بے ہوش پائے جاتے اس پر ستم یہ کہ مالی آسودگی بھی میسر نہ تھی۔ میر سادات کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور انتہائی خود دار تھے۔ بادشاہوں کی مداح طبیعت کی حساسیت اور خود داری کے منافی تھی۔ لہٰذا مالی تنگی کا بھی شکار تھے۔ خارجی حالات کو دیکھا جائے تو میر کا دور نہایت پر آشوب دور تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔ شورشیں برپا ہونے لگیں اور دہلی کا پایہ تخت سازشوں کا شکار ہو گیا۔ مغلیہ خاندان کے لوگ بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ عوام الناس دہلی کو خیر آباد کہنے لگے۔

بودہ　　ام　　میر　　شہر　　آبادے
رفتہ　　رفتہ　　خراب　　گردیدم[۲۳]
آں　　غنچہ　　ام　　کہ　　موسم　　آخر　　رسیدہ　　ام
تا چشم　　وا کنم　　کہ　　بہار　　از　　نظر　　گزشت[۲۴]

یہ داخلی اور خارجی حالات، میرؔ صاحب کی خود دار اور حساس طبیعت پر اثر انداز ہونے لگے۔ میرؔ نے دہلی کو اپنی آنکھوں سے اجڑتے دیکھا تو ان کا دل متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ اس طرح میر کی شاعری دل اور دہلی، غم دوراں اور غم جاناں سنگم بن گئی۔ غموں کی شدت نے میرؔ کو حزن پرست بنا دیا۔ آرزو کی شکست، زندگی کی بے ثباتی اور انسانیت کی تذلیل نے بھی میرؔ کی شخصیت پر انمٹ نقوش چھوڑے میر کی شاعری میں غم آنسو بن کر ٹپکنے لگا۔

میر غم سے مغلوب رہتے تھے لیکن جس طرح یہ غم ان کے فن میں اظہار پاتا ہے، اس سے غم کے قنوطی اثرات ختم ہو جاتے ہیں میرؔ ایک عظیم فنکار تھے انہوں نے احساس غم کو گوارہ بنا لیا۔ احساس غم میر کو ہمیشگی عطا کرتا ہے۔ ان کا کمال فن یہ ہے کہ ان کے ہاں دل اور دلی کا غم ہم آغوش ہو جاتا ہے۔" میر کے غم کو دو انداز سے دیکھا گیا ہے۔ ایک یہ کہ میر کے غم میں چونکہ غم دوراں چھپا ہوا ہے اس لیے میر جن حالات سے دوچار ہوئے ان کی ترجمانی میر نے کر دی دوسرا یہ کہ غم چوں کہ ان کی فطرت کا مخصوص حصہ تھا اس لیے ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے لیکن اگر میر کے غم کی یہی نوعیت ہے تو اس سے میر کی سی بڑی شاعری پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ میر کی شاعری اگر ایسی ہوتی تو وہ بہت عرصے تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ میر تو اپنے غم کے اظہار سے اپنے قاری کو پستی کے عالم سے اٹھا کر بلندی کی طرف لے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ میر نے غم کو اپنے فن میں سمو کر ہمارے لئے تسکین بخش بنا دیا ہے اور جب ہم ان کے شعر پڑھتے ہیں تو ایک قسم کی علویت محسوس کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔، انسانی فطرت کا خاصا ہے

کہ وہ ایک انتہا پر پہنچ کر اس سے متضاد راستے پر چل نکلتی ہے۔ میر کے غم کی بھی یہی نوعیت ہے۔ وہ زندگی سے ہمارا تعلق قطعہ نہیں کرتا بلکہ لطافت سے ہمکنار کر کے ہمیں احساس علویت دیتا ہے۔ اسی لیے یہ ایسا الم ہے جس میں نشاط کا سامزہ ہے اور ایسا نشاط ہے جس میں الم کا سامزہ ہے۔ میر اپنے لہجے سے غم والم کو غم والم نہیں رہنے دیتے بلکہ کچھ اور بنا دیتے ہیں جس کا اثر شکستگی اور پسپائیت کا نہیں بلکہ مثبت ہوتا ہے۔" (۲۵)اسی غم اور اس کی گہرائی نے میر کے فن کو سادگی اور سوز بخشا اسی سے ان کے کلام کی تاثیر دوچند ہو گئی۔ اسی باعث میرؔ بڑے شاعر بن سکے اور ان کا فن آفاقی فن کی حیثیت اختیار کر گیا میر کے غم کا تاثر ناگوار نہیں بلکہ نشاط انگیز اور سکون آفریں ہے۔ میر نے غم کو نشتر نہیں بنایا بلکہ غم ان کے ہاں زندگی کے اعلیٰ اہداف کی تکمیل کا ذریعہ بن گیا۔ غم کے باعث میر کی شخصیت منفرد ہو گی اور یہ انفرادیت آج بھی اسی بلکہ اس سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے جتنی کہ اس دور میں تھی۔"میر کے غم میں تلخی، بیزاری اور زہر بھری یاسیت کی بجائے صبر، تسلیم و رضا اور جہاں بینی کا احساس ہوتا ہے۔ اتنے پہاڑ جیسے غموں کے باوجود میر کی بڑی عمر کا راز یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری سے خود اپنے غموں کا تزکیہ (کیتھارسس) کیا ہے اور یہی تزکیاتی اثر میر کی شاعری پڑھنے والے پر ہوتا ہے۔ بڑی شاعری میں غم کی نوعیت ہمیشہ مثبت ہوتی ہے۔"(۲۶)غم نے میر کی شخصیت کو نکھارا اور ان کے اندر بے نیازی اور درویشی کی صفات پیدا ہو گیئں۔ اتنے غموں کے باوجود میر نے طویل زندگی پائی اور ان کا فن امر ہو گیا۔ پھر میرؔ روتے اور رُلاتے رہے۔ ٹھیس کھاتے اور آبلے کی طرح پھوٹ بہتے رہے، عشق کی ناکامی کا ماتم کرتے رہے، لیکن درحقیقت یہی اوصاف ان کے فن کو بڑا کر گئے۔ اسی باعث میر نے انسانیت کے درد کو اپنے درد کی طرح محسوس کیا۔ اگر وہ چوٹ کھائے ہوئے نہ ہوتے تو دوسروں کے درد کو محسوس نہ کر پاتے میر کے شعر کی تاثیر اسی دردمندی کا ردعمل ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں میر کا ذکر نہیں کیا لیکن شعوری یا لاشعوری طور پر اقبال، میرؔ کے افکار سے اثر پذیر ہوئے ہیں۔ میر ایک رجحان ساز شاعر ہیں بہت سے غزل گو شعراء نے ان کی پیروی کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کام دانستہ سعی کا نہیں تھا۔ اس کے لیے میر کے سے حالات سے گزرنا اور میر کا سا دل و دماغ ہونا ضروری ہے۔ اقبال کا فلسفہ غم مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے۔

غم نہیں غم، روح کا ایک نغمہ خاموش ہے
جو سرود بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے(۲۷)

اقبال کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کے حرف حرف سے غم آنسو بن کر بہہ رہا ہے اور یہ آنسو صرف دکھ کا آنسو نہیں بلکہ اس غم نے اقبال پر موت کے راز منکشف کر دیے ہیں اور اقبال کا فلسفہ موت اس غم کی وساطت سے، اپنی پوری شاعرانہ تاثیر کے ساتھ دلوں میں اتر تا چلا جاتا ہے۔ یہ غم بھی میر کے غم کی طرح تزکیاتی اثر رکھتا ہے۔ اقبال کی طبیعت کو قدرت نے ایسا سوز بخشا ہے جس سے ان کی شاعری پُر تاثیر ہو گئی ہے۔ لیکن اقبال کا غم میر کی طرح زندگی کی تلخیوں کے باعث نہیں بلکہ یہ نوائے قدرت ہے۔ اقبال کا دل پر سوز ہے۔ وہ انسان کا درد محسوس کرتے ہیں اور انسانیت کا بھی۔ ملت اسلامیہ کی خستہ حالی پر گریہ کناں ہیں اور انسان کی غفلت پر بھی۔ اقبال کا غم صرف درد کی نشاندہی یا دکھ کا اظہار ہی نہیں کرتا بلکہ غم کی تشخیص بھی کرتا ہے اور درد کا مداوا بھی۔ اقبال کی نظم بہ عنوان "شاعر" کا مفہوم ہے کہ قوم ایک جسم کی مانند ہے۔ افراد اس جسم کے اعضاء ہیں اور شاعر اس جسم کا دیدہ بینا ہے گویا سب سے حساس عضو ہے۔ فرد و ملت کا غم اقبال کی نوائے پر سوز بن جاتا ہے۔ وہ فرد و اجتماع کے ظاہر و باطن کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑتے کہ جس کا درد محسوس نہ کریں اور اس کی دوا نہ کریں۔ اسی باعث وہ حکیم الامت ہیں۔ انسانی زندگی میں جو غم کا حصہ ہے اقبال بہت خوبصورتی سے اس کی ترجمانی کرتے ہیں:

شبِ زار نالید ابرِ بہار
کہ ایں زندگی گریِ پیہم است
درخشیدہ برقِ سُبک سیر و گفت
خطا کردہ خندۂ یک دم است
نہ دانم بہ گلشن کہ برد ایں خبر
سخنہا میانِ گل و شبنم است (۲۸)

جس طرح میر کے ہاں دہلی کی بربادی ان کے تہذیبی شعور میں نظر آتی ہے۔ اسی طرح اقبال بھی اپنے دور کے نباض ہیں وہ ہندوستان کی بربادی اور غلامی کے طوق پہ نوحہ گری کرتے ہیں۔ اقبال کی نظم "شمع اور شاعر" اور "تصویر درد" اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہیں۔ شمع جو سوزِ غم میں دوسروں کے لئے جلتی ہے خود درد سہہ کر دوسروں کو روشنی دیتی ہے، شاعری کی اعلیٰ ترین روائت کی ترجمان ہے۔ اس نظم میں شمع کی زبان، جو کہ اردو شاعری کی روائت کا حصہ ہے، منفرد انداز میں گویا ہوتی ہے۔

شمع شاعر سے محو کلام ہے کہ میرا جلنا تو میری گھٹی میں پڑا ہے۔ تم بھی پُرسوز طبیعت رکھتے ہو لیکن تم شہرت کے لیے جلتے ہو۔ تم ابھی طوفان کی لذت سے ناآشنا ہو۔ شمع سراپا درد ہے اور رات بھر جلتی ہے۔ رات جو ظلمت کا استعارہ ہے۔ شمع ظلمت میں نور بکھیرتی ہے۔ شاعر کو انسانیت کی رات کو اجالوں سے ہمکنار کرنا ہے۔ اس کے لیے اسے مسلسل اشک فشانی اور درد مندی کی ضرورت ہے اقبال ملت کا غم محسوس کرتے ہیں۔ اقبال کی شاعری اور سوزِ غم، لازم و ملزوم ہیں۔ اس سوز میں شاعر کا جگر خون ہوتا ہے خواہ یہ غم شاعر کا ذاتی ہو، انسانیت کا درد ہو یا ملت کا، جب تک سوزِ دروں کی آمیزش نہ ہو شعر گوئی ممکن نہیں۔

حق اگر سوز نہ دارد حکمت است
شعر می گردَد چو سوز دل گرفت[۲۹]

میر کی شاعری میں انسان کا تصور بھی ملتا ہے میر کے انسان کا سفر ارتقائی ہے لیکن میرؔ انسان کو خدا نہیں بناتے اسے انسان ہی رہنے دیتے ہیں۔ اگرچہ میرؔ عظمت آدم پہ نازاں ہیں لیکن میرؔ کا انسان بے بس بھی ہے، مجبور بھی، خطا کار بھی ہے، گناہ گار بھی، جذباتی بھی ہے، طلب گار بھی، لیکن اس کے ساتھ اعلیٰ وارفع بھی ہے، بلند و بالا بھی اور شکر گزار بھی۔ میر کا انسان جب ترقع کی منازل طے کرتا ہے تو اسے مشت خاک سے نور مطلق کے سفر تک برسوں کی محنت اور ریاضت درکار ہے۔ یہ راہ نہایت دشوار گزار اور پرخار ہے، اس سے گزر کر ہی انسان صاحب نظر بنتا ہے۔

دل و عرش دونوں کا ہے پایا بلند
سیر رہتی ہے ان مکانوں پر[۳۰]

یہ مشت خاک جو کائنات کے گرد و غبار میں مل کر، اپنی خاکی سرشت کی نسبت سے، گرد و غبار ہو جاتا ہے یعنی ذلیل و خوار ہوتا ہے، لیکن جیسے ہی اس کی رسائی نور تک ہوتی ہے اور اس کے اندر روح کا احساس بیدار ہوتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا مقدور تو آسمانوں سے بھی آگے ہے یعنی انسان کے دونوں رخ میر کا موضوع ہیں۔

جس کو تم آسمان کہتے ہو
سو دلوں کا غبار ہے اپنا[۳۱]

جسم خاکی کا جہاں پردہ اٹھا
ہم ہوئے وہ میرؔ ، وہ سب ہم ہوا (۳۲)

" خود شناسی کی یہ منزل خدا شناسی ہی کی ایک صورت ہے جو اکثر شاعروں کے یہاں محض روایت ہے، صرف بعض کے یہاں تجربہ بن سکی ہے کیونکہ یہ نفسی کیفیت کامل خود شناسی یا ریاضت کے بغیر ممکن نہیں اور میرؔ کو بھی ہم ان خود شناسوں میں جگہ دے سکتے ہیں۔"(۳۳) " میرؔ کے انسان کا سر کسی کے آگے نہیں جھکتا وہ انہیں حیرت سے دیکھتے ہیں جنہیں بندگی خواہش ہے ان کا انسان خدا بننے کے خواب دیکھتا ہے لیکن ایسا خدا جس میں انسانی صفات موجود ہوں۔"(۳۴) میرؔ کا انسان فرشتے سے بلند مقام رکھتا ہے وہ آذر کو طعنہ دیتے ہیں کہ پہلے خود کو انسان تو بنا لو۔ میرؔ کے نزدیک انسان بننے میں بڑی محنت اور ایک مدت درکار ہے۔

میرؔ انسان کو بلندی سے ہمکنار کرتے ہیں تو وہ ساری کائنات پہ حاوی ہو جاتا ہے اسی آدم خاکی نے خلافت ارضی کا بوجھ اٹھایا یہ اسی انسان کا حوصلہ تھا۔ میرؔ کے انسان پر جب مشکل وقت آتا ہے تو وہ شکست تسلیم نہیں کرتا، وہ گردش ایام اور تلخی دوراں کے کڑوے گھونٹ پی پی کر نڈھال اور خستہ حال تو ہو جاتا ہے لیکن اس کی ذہنی رسائی اب بھی شرف انسانی کی قائل ہے۔ سختیاں جھیل کر بھی توقیر آدم کے نغمے الاپنا کچھ میر ہی کا خاصا ہے میر کی دانست میں ایک مشت خاک کو شرف انسانیت عطا کرنا رب کریم کی خاص عنایت ہے۔ انسان جو اللہ کا نائب اور تمام مخلوقات میں مقرب الٰہی ہے۔ میر اس لطف و کرم پر اللہ کے شکر گزار ہیں۔

شکر کیا اس کی کریمی کا ادا بندے سے ہو
ایسی اک نا چیز مشتِ خاک کو انساں کیا(۳۵)

میرؔ کے ہاں آدمی اور انسان تقریباً ہم معنی ہیں کہیں کہیں انسان، آدمی کی ترقی یافتہ صورت ہے لیکن آدمی بھی کم تر نہیں۔ اس عظمت و توقیر اور شکر گزاری، خود شناسی اور روحانی بلندی میں میر کا انسان باکمال ہونے کے ساتھ ساتھ نیاز مند بھی ہے اقبال کا تصور انسان دراصل ان کا مرد مومن ہے۔ اس انسان کی خودی کی تکمیل ہو چکی ہے یہ مقربِ الٰہی ہے اس کی نگاہ سے اقوام عالم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ کی قوت کا امین ہے۔ اس کے وجود سے بحر و بر لرزتے ہیں۔ باطل اس کی ہیبت سے زمیں بوس ہو جاتا ہے۔ مرد مومن یا مردِ حُر اقبال کا مثالی انسان ہے۔ اس تصور سے قطع نظر بھی اگر دیکھا جائے تو اقبال عظمت آدم کے نغمے الاپتے رہے۔ یہ آدم خدا سے شکوے کا حق

رکھتا ہے اس کا جوش جنوں حضرت یزداں میں بھی خاموش نہیں رہتا۔ اس آدم کو خدا کے مقابل اپنی تخلیق پہ ناز ہے پیام مشرق کی نظم "محاورہ مابین خدا او انسان" میں انسان خدا سے کہتا ہے:

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم(۳۶)

یہ انسان مسجود ملائک ہے، اس کا عشق اسے فرشتے کا مسجود بناتا ہے اقبال کے نزدیک عشق بڑی جگر داری اور حوصلے کا مقام ہے جو فرشتے کے بس کا روگ نہیں۔ روح ارضی جب آدم کا استقبال کرتی ہے تو کائنات کے سارے راز اور سارا حسنِ عالم اسے انسان کے تابع نظر آتا ہے کیونکہ اسی آدم نے خلفۃ الارض کا بوجھ اٹھایا تھا۔ اقبال کو عالم گردوں، عالم بشریت کی زد میں نظر آتا ہے۔ لیکن یہی آدم جب خود شناس نہیں بنتا تو اقبال اس کی پستی کا شکوہ بھی اللہ سے ہی کرتے ہیں۔

درحقیقت یہ آدم زاد کو اس کی اصلیت اور اس کے مقام کی طرف متوجہ کرنے کا طریقہ ہے اقبال سمجھتے ہیں کہ انسان کو بابصیرت، خود شناس اور خدا شناس ہونا چاہیے اس صورت میں وہ انسانیت کا حق ادا کر سکتا ہے۔ ورنہ زندگی انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر بے مغز اور بے نور رہ جاتی ہے اور انسان مادی زندگی کی بھول بھلیوں میں زندگی گزار کر رزق خاک بن جاتا ہے جو کہ توہین آدم ہے اقبال انسان کو خود شناسی سے ہمکنار کرتے ہیں، اسے نگاہ بصیرت اور بلند پروازی دیتے ہیں، اسے خود دار بناتے ہیں تاکہ وہ اللہ کا نائب ہونے کا حق ادا کر سکے اقبال کا انسان شاہین کی صفات رکھتا ہے بلند پرواز ہے، تیز نگاہ ہے، خود دار ہے، بے نیاز ہے یہی صفات اقبال انسان میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اقبال انسان کو اس مقام پر دیکھتے ہیں جہاں وہ کارِ یزداں میں مخل ہو رہا ہے حور و فرشتہ اس کے دام تخیل کے اسیر ہیں۔ اس کائنات کا سب سے بڑا راز انسان ہی تو ہے۔ اگرچہ اقبال کا تصور انسان میرؔ سے کچھ مختلف ہے لیکن بنیادی فرق اقبال کے منفرد اسلوب کا ہے ورنہ میرؔ کا تصور انسان بھی بڑی وسعت و رفعت کا حامل ہے۔

ملیے اس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے یک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے(۳۷)

میرؔ ایسا باکمال آدم زاد کہ جسے کبھی زوال نہیں۔ اس کی عدیم المثال شاعری جس کے متعلق اس کا دعوی تھا کہ مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں، مدت تو کیا صدیاں بیت گئیں اور میرؔ کی باتیں آج بھی زندہ ہیں اور جس خون جگر سے انھوں نے یہ باتیں رقم کی ہیں وہ آج بھی تازہ ہے لیکن بزبان خود انہیں اپنے کمال پر بہت کم ناز ہے یہ با کمال آدم خاکی اپنی مٹی کے ساتھ جڑا ہوا ہے لیکن جب پر پرواز پھیلا تا ہے تو کئی زمانوں پر حاوی ہے یہ خدائے سخن جب مشق سخن کرتا ہے تو نہ صرف اس کی نوائے دل نواز خلق کو اپنی جانب کھینچتی ہے بلکہ اس کی خاموشی کا بھی ایک عالم گرویدہ ہے میرؔ کس طرح سارے عالم پہ چھا گئے اور ان کا سخن مستند ٹھہرا، یہ دل کو خون کرنے کا سفر ہے۔ ایک آدمی اپنی ذات میں کل کائنات کیسے بن گیا وہ جس کے آنسوؤں سے کاغذ نم رہتے، جو روتے روتے سو جاتا جس کے گریے میں اتنی تاثیر ہے کہ وہ دوسروں کو بھی رلا دے، اس کے تجربۂ حیات میں ایسا خلوص کار فرما ہے جو اسے حیات ابدی سے ہمکنار کرتا ہے۔ اس کی مدتیں صدیوں کو محیط ہو جاتی ہیں اور میرؔ آج بھی منفرد ہے۔ ہر آنے والا دور میرؔ شناسی میں اضافہ کر رہا ہے اس کے فن کی وسعت مسلّم سے مسلّم تر ہو رہی ہے۔ یہ ایسا انسان ہے جس نے آدمی سے خود کو عالم بنایا، یعنی جو ذرے سے صحرا اور قطرے سے سمندر بنا، یہ سارا سفر انسان کا باطنی سفر ہے۔ اور یہ تمام عوامل میرؔ کے تصور انسان کو سمجھنے میں بھی معاون ہیں۔ حیات و ممات کا تصور بھی میرؔ اور اقبال دونوں کے ہاں نظر آتا ہے۔ میرؔ زندگی کو عطیہ خداوندی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ زندگی صرف گردشِ شام و سحر کا نام نہیں بلکہ حیاتِ ابدی کا سفر ہے جو تمام جہانوں کو محیط ہے میرؔ کے ہاں یہ سفر موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔

کیا رنگ و بو و بادِ سحر سب ہیں گرم راہ
کیا ہے جو اس چمن میں ہے ایسی چلا چلی(۳۸)

یعنی اس سفر میں مظاہر کائنات بھی شریک ہیں جو منزل ابدی کی طرف گامزن ہیں یہاں میرؔ کی فکر، اقبال سے بھی آگے کا سفر کر رہی ہے اقبال جب حیاتِ مسلسل کی بات کرتے ہیں تو ان کی مراد صرف انسان سے ہے۔

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں(۳۹)

میر کے ہاں حیات ابدی کا، ایک مستقل تصور ہے اور دنیا کی بے ثباتی جو میرؔ کو تجربہ ہوئی جسے انہوں نے اپنے اشعار میں سمویا ہے جس کے باعث میر کو قنوطی بھی کہا گیا، حالانکہ درحقیقت یہ قنوطیت نہیں تھی، اب یہاں میرؔ ایک نئے حوصلہ افزا رنگ میں سامنے آتے ہیں۔ میر کے ہاں حیات بعد الموت کا تصور میرؔ کی حساسیت کو عرفان میں بدل دیتا ہے۔

مرنا ہے خاک ہونا ہو خاک اڑتے پھرنا
اس رہ میں ابھی تو درپیش مرحلے ہیں(۴۰)

اقبال کے ہاں بھی تصورِ حیات کی واضح صورت نظر آتی ہے اقبال کا فلسفہء زندگی اردو شاعری میں منفرد مقام کا حامل ہے۔ اقبال کا حیات بعد الموت کا تصور بہت جامع ہے۔ میرؔ کے ہاں زندگی کی تلخیاں موت کی آغوش میں سکون پاتی ہیں اس سکون کے بعد پھر گرم سفر ہونا ہے موت گویا زندگی کا ایک وقفہ ہے "میر کے نزدیک زندگی کا سفر بہت طویل اور بے انتہا تو ہے لیکن مابعد الموت راحت کا واضح تصور وہ نہیں دلا سکے پھر بھی حیات کے تسلسل کا عقیدہ اس سے ضرور نکلتا ہے۔"(۴۱) اقبال کے ہاں بھی موت زندگی کا اگلا مرحلہ ہے میر کہتے ہیں۔

مرگ کیا منزل مراد ہے میر
یہ بھی اک راہ کا توقف ہے(۴۲)

میرؔ اور اقبال کے تصور حیات و ممات میں مماثلت ضرور ہے البتہ اقبال کا تصور زیادہ جامع ہے۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں(۴۳)

سید عبداللہ نے نقد میر میں میرؔ کی تقلید کی بات کی ہے کہ بہت سے شعرا نے میرؔ کی بحروں میں ان کے ردیف قافیہ کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے اور ان کے رنگ میں غزل کہنے کی کوشش کی ہے لیکن کوئی میرؔ نہیں بن سکا سید عبداللہ رقمطراز ہیں :

- ☆ دور جدید کو ایک نئے میرؔ کی ضرورت ہے مگر میر نقالی سے پیدا نہیں ہوا کرتے ہمیں تو زندگی کی مصنوعی اور کھوکھلی قدروں سے روٹھنے والے میر کیؔ ضرورت ہے۔
- ☆ اس میرؔ کی جو انسانی شرافتوں کی تذلیل کے خلاف بھرپور احتجاج کرے
- ☆ اس میرؔ کی جو فضیلتوں کی کساد بازی پر شہر آشوب لکھے۔
- ☆ اس میرؔ کی جو، جوہر انسانیت کی بے قدری اور جھوٹ کے خلاف آواز اٹھائے۔
- ☆ یہ میر وہ میر ہو جو اس جھوٹی اور کھوکھلی دنیا میں احساسات کی سچائی اور جذبات کی طہارت کا اعلان کرے۔

ہمارے زمانے کو ایسے میرؔ کی بے شک ضرورت ہے ــــــ مگر اس کے لیے ارزاں تشہیر کی بجائے سچائی، ریاضت اور مجاہدے کی مانگ ہوگی اور تقلید کی بجائے تخلیق کی کوشش درکار ہوگی کیونکہ فن میں تقلید کی شارع عام پر چلنے کی جگہ انفرادیت کی راہ زیادہ اہمیت رکھتی ہے"[۴۴] اس حوالے سے دیکھا جائے تو سید عبداللہ کی یہ آرزو اقبال پوری کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اقبال میرؔ کے مقلد نہیں لیکن انہی لوازمات کے ساتھ اقبال نے شاعری کی ہے جو میر کی منفرد خصوصیات ہیں لیکن اقبال میر کے رنگ میں رنگے ہوئے نہیں وہ خود ایک عظیم فنکار ہیں البتہ اقبال کے فکری عناصر پہ میر کا اثر ضرور ہے اقبال اپنی نظم شکوہ اور بہت سے دوسرے اشعار میں انسانی شرافتوں کی تذلیل کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، انسانی اقدار کی پامالی کا ماتم کرتے ہیں اور دنیا کی جھوٹی اور کھوکھلی اقدار جو تہذیب حاضر اور سماجی روایات کی شکل میں ایک عفریت بن کر انسانیت پر مسلط ہیں، اقبال اپنے خلوص اور جذبے سے ان کی مصنوعی اور وقتی چمک کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہیں، جو انسان کے باطن کو تاریک کر کے اسے لامتناہی اندھیروں میں چھوڑ دیتی ہیں، جہاں انسان کو نہ صرف اپنا سراغ نہیں ملتا بلکہ زندگی کی روحانی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔ افکارِ اقبال کو میرؔ کا تتبع تو نہیں کہا جا سکتا لیکن قوم کے اجتماعی فکری سفر میں اقبال کا شعور یا لاشعور میرؔ سے متاثر ضرور ہے۔

حوالہ جات

۱۔ میر تقی میر، کلیات غزلیات میر مرتبہ ڈاکٹر علی محمد خان، لاہور: الفضل ناشران، ۲۰۱۳ء، ص ۳۹۱

۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۵ء، ص ۵۷۸

۳۔ افضال احمد سید، مترجم دیوان میر فارسی، کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء، ص ۵۲

۴۔ کلیات غزلیات میر، 〃 〃 〃 〃 ص ۷۵۵

۵۔ تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، 〃 〃 ص ۵۷۸

۶۔ انتخاب کلام میر، مرتب ڈاکٹر مولوی عبد الحق، لاہور: لاہور اکیڈمی، س۔ن، ص ۲۷

۷۔ کلیات غزلیات میر 〃 〃 〃 ایضاً ص ۷۵

۸۔ پروفیسر آل احمد سرور، مجموعہ تنقیدات، لاہور: الوقار پبلیکیشنز، ۱۹۹۴ء، ص ۱۳۳

۹۔ تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی 〃 〃 ایضاً ص ۵۷۵

۱۰۔ کلیات غزلیات میر 〃 〃 〃 ایضاً، ص ۳۲۷

۱۱۔ ایضاً 〃 〃 〃 ایضاً ص ۴۷۹

۱۲۔ تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، 〃 ایضاً ص ۵۷۹

۱۳۔ اقبال، پیام مشرق، لاہور: شیخ غلام علی پبلشرز، ۱۹۸۹ء، ص ۱۲۸

۱۴۔ کلیات غزلیاتِ میر، 〃 〃 〃 ایضاً ص ۶۴۶

۱۵۔ علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال اُردو، لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۰۵ء، ص ۵۰/۵۴

۱۶۔ ایضاً، 〃 〃 〃 〃 ص ۲۷/ ۲۲۱

۱۷۔ تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، 〃 ایضاً، ص ۵۸۰

۱۸۔ ایضاً، 〃 〃 〃 〃 ص ۵۸۱

۱۹۔ انتخاب کلام میر، 〃 〃 〃 ایضاً، ص ۲۳۳

۲۰۔ کلیاتِ غزلیات میر، 〃 〃 〃 ایضاً، ص ۲۷۸
۲۱۔ مجموعہ تنقیدات، 〃 〃 〃 ایضاً، ص ۱۳۹
۲۲۔ دیوان میر فارسی، 〃 〃 〃 ایضاً، ص ۱۶
۲۳۔ ایضاً، 〃 〃 〃 〃 ص ۳۰۴
۲۴۔ ایضاً، 〃 〃 〃 ایضاًص ۷۲
۲۵۔ تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایضاً، ص۵۸۵
۲۶۔ ایضاً، 〃 〃 〃 〃 ص۵۸۶
۲۷۔ کلیات اقبال اردو، 〃 〃 〃 ص۱۲۱/۱۱۷
۲۸۔ پیام مشرق، 〃 〃 〃 ایضاً، ص ۹۶
۲۹۔ ایضاً، 〃 〃 〃 〃 ص۱۰۶
۳۰۔ کلیاتِ غزلیات میر، 〃 〃 〃 ایضاً، ص ۳۴۹
۳۱۔ ایضاً، 〃 〃 〃 〃 ص۱۶۵
۳۲۔ ایضاً 〃 〃 〃 〃 ص۱۹۴
۳۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، نقد میر، لاہور: مکتبہ خیابان ادب، س ن، ص ۱۱۳
۳۴۔ تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، 〃 〃 ایضاً، ص ۵۷۹
۳۵۔ کلیاتِ غزلیات میر، 〃 〃 〃 ایضاً، ص ۲۱۱
۳۶۔ پیام مشرق، 〃 〃 〃 ایضاً، ص ۱۱۴
۳۷۔ انتخاب کلام میر، مرتب ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ایضاً، ص ۲۳۳
۳۸۔ کلیاتِ غزلیات میر، 〃 〃 〃 ایضاً، ص ۷۰۸
۳۹۔ کلیات اقبال اردو، 〃 〃 〃 ایضاً، ۲۷۲/۳۸

۴۰۔	کلیات غزلیات میر،	〃	〃	〃	ایضاً، ص ۵۱۹
۴۱۔	نقد میر،	〃	〃	〃	ایضاً، ص ۱۰۹
۴۲۔	کلیات غزلیات میر،	〃	〃	〃	ایضاً، ص۷۷۶
۴۳۔	کلیات اقبال اردو،	〃	〃	〃	ایضاً، ص۳۸/۲۷۲
۴۴۔	نقد میر	〃	〃	〃	ایضاً، ص ۱۸۹،۱۸۸